ترکی میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ

خلیل حامدی

زیرِ نظر مضمون ترکی کے موجودہ حالات کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے لیکن ہم اصل موضوع پر اظہارِ خیال کرنے سے قبل یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ترک قوم کو اپنے تشکّر و امتنان کا بصمیمِ قلب خراج پیش کریں۔ ترکی کے عوام، ترکی کے حکمران، ترکی کے اپوزیشن رہنما، سب نے بحیثیتِ مجموعی ہماری آزمائش پر جس تڑپ اور قلق کا اظہار کیا ہے وہ لاریب اُس کے گہرے ملّی شعور، مضبوط قومی اخلاق، اور لازوال عشقِ اسلام کا آئینہ دار ہے۔ ہمارے اور ترک قوم کے درمیان قُرب و مُودّت کے رشتے پہلے بھی کم مضبوط نہ تھے مگر اب یہ تعلق ایسی یگانگت میں تبدیل ہوگیا ہے جس سے دونوں ملکوں کی تاریخ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مصیبت کی گھڑی میں کسی کی مدد کو لپکنا اگر مصیبت زدہ کے نقطۂ نظر سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے تو خود مددگار کے نقطۂ نظر سے بھی دنیا و آخرت میں خیرِ کثیر کا مُوجب ہے۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۶۵ء کی صبح تُرکی میں نئے خوشگوار انقلاب کی خبر لائی ہے۔ انتخابات میں عدنان مِیندریس مرحوم کی پارٹی کا نمایاں اکثریت کے ساتھ کامیاب ہونا اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ فوج اور سول سروس نے انتخابات میں بے جا مداخلت نہیں کی۔ پھر اقتدار کا پورے امن کے ساتھ جیتنے والی پارٹی کی طرف منتقل ہوجانا اس بات کی کھلی علامت ہے کہ ترکی میں جمہوری روایات جڑ پکڑ چکی ہیں اور ترکوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے کہ خونی انقلابات اور فوجی سازشوں کے ذریعہ سے اقتدار کے اُلٹ پھیر کا راستہ ان کے لیے خطرناک ہے اور پُر امن تغیرات کا دروازہ کھلا رکھنے ہی میں ان کی خیر ہے۔ تغیّر تو اللہ تعالیٰ کی ایک سنّت ہے جسے لازمًا اپنا کام کرنا ہی ہے۔ ایک

قوم کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ اس سُنّت کو اپنے ہاں اس طرح جاری کرے۔ انسانیت کے لیے جو چیز انفع ہے اُسے پنپنے کا موقع دیا جائے۔ اس سنّت سے تاریخ کے کسی مرحلے نے جب کبھی انحراف کیا ہے، اُس کا نتیجہ فلاح و ترقی سے بُعد کی صورت میں نکلا ہے۔ ترکی کا نیا تغیّر یکایک وجود پذیر نہیں ہو گیا، بلکہ اس کے لیے ۱۵ سال کی مدّت درکار ہوئی ہے۔ تغیّر کے بیج تو بہت پُرانے تھے مگر اس کی پہلی کونپل سنہ ۴۶ء میں نمودار ہوئی۔ ۱۵ سال تک تغیّر کا خمیر پکتا رہا اور بالآخر اس سال ۱۲ اکتوبر کا انتخاب اُسے فیصلہ کُن مرحلے میں لے آیا۔ تغیّر کے محرّکات میں سے سب سے بڑا محرک اسلام ہے اس لیے ہم تمام محرکات اور اُن کے اسباب کا جائزہ لینے کے بجائے صرف اسلام کے نقطۂ نظر سے اس موضوع پر کلام کریں گے۔

عصمت انونو کی ری پبلکن پارٹی پہلی مرتبہ ۱۹۵۰ء میں زوال سے آشنا ہوئی، اور جلال بایار اور عدنان میندریس کی ڈیموکریٹک پارٹی کے عروج کا آغاز ہوا[1]۔ ۱۹۵۴ء کے انتخابات میں اس کی قوت و نفوذ میں مزید اضافہ ہوا[2] اور ۶۰ء تک ترکی پر ڈیموکریٹک گورنمنٹ حکومت کرتی رہی، جس کے صدر جلال بایار اور وزیر اعظم عدنان میندریس تھے۔ مصطفٰی کمال پاشا اور عصمت انونو کے سخت گیر نظام اور ری پبلکن پارٹی کی بے پناہ آہنی گرفت کو جس چیز نے ہلا دیا وہ ڈیموکریٹک پارٹی (اور خاص طور پر عدنان میندریس) کے وہ وعدے تھے جو انتخابات کے موقع پر اس نے ترکی عوام سے چند مذہبی اصلاحات بروئے کار لانے کے لیے کیے تھے۔ عرصۂ دراز کے بعد جب ترک مسلمانوں کے کانوں میں مذہب کی آواز پڑی اور وہ بھی انتخابی پلیٹ فارم سے، تو انہوں نے ہر طرح کے دباؤ کے باوجود اپنا بوجھ ڈیموکریٹک پارٹی کے پلڑے میں ڈال دیا[3]۔ اگرچہ

---

[1] ۵۰ء کے الیکشن میں ڈیموکریٹک پارٹی کو ۴۸۷ کے ایوان میں ۴۰۸ نشستیں حاصل ہوئیں۔ مقابلے میں ری پبلکن پارٹی تھی جسے شکست فاش ہوئی۔ [2] ڈیموکریٹک پارٹی کو ۵۰۰ سو اور ری پبلکن کو صرف ۲۸ نشستیں ملیں اس وقت ڈیموکریٹک پارٹی کے صدر جلال بایار اور سیکرٹری عدنان میندریس مرحوم تھے۔

[3] ایک امریکی مصنف لکھتا ہے "اسلام کے اثرات کی شدت کا یہ عالم ہے کہ لادین ترکی تک میں

برسرِ اقتدار آنے کے بعد شروع شروع میں اس پارٹی نے ان وعدوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور بعض پہلوؤں سے اس نے وہی اقدامات کیے جن کا الزام وہ ری پبلکن حکومت کو دیتی رہی تھی۔ لیکن عوام کی تائید حاصل کرنے کے لیے اُسے اسلام کے حق میں بعض اچھے اقدامات کرنے پڑے جو اگرچہ محدود نوعیت کے تھے مگر پہلی حالت کے مقابلہ میں بہتر امکانات پیدا کرنے والے تھے۔ ان اقدامات کا خلاصہ یہ ہے:

ترک مسلمانوں کو تیس سال کا دورِ جبر گزارنے کے بعد پہلی مرتبہ عربی میں اذان پڑھنے کی اجازت ملی۔ جمعہ کے روز دس منٹ کے لیے ریڈیو سے عربی میں قرآن کی تلاوت ہونے لگی۔ حج پر سے پابندیاں کم ہوئیں۔ مصطفیٰ کمال اور عصمت انونو کے عہد میں ترکی کی بڑی بڑی مساجد بالکل ویران ہو گئی تھیں، بلکہ بعض تاریخی مسجدوں کو میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ عدنان حکومت نے ان تمام مساجد کی مدتوں کے بعد ازسرِنو مرمت کروائی۔ ۱۹۵۶ء میں مصطفیٰ کمال کے مقبرے کے سامنے ایک نئی عظیم الشان مسجد بنوائی جس کے لیے عدنان مندریس نے اپنی جیب سے ایک لاکھ دینار کا چندہ دیا۔ قرآن مجید حفظ کرنے والوں کی قدرافزائی کی گئی اور ان کے لیے وظائف جاری ہوئے۔ مساجد کے لیے ائمہ و خطباء تیار کرنے کا اہتمام کیا گیا اور اس کے لیے دینی تعلیم کے مدارس جاری کیے گئے۔ ۱۹۵۱ء میں جب پہلی مرتبہ استنبول، انقرہ، قونیہ، اور قیصری کے شہروں میں ان مدارس کا افتتاح ہُوا تو ترک مسلمانوں کے اندر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ یہ مدارس اونچے درجے کے نہ تھے مگر چونکہ حکومت کے زیرِ اہتمام ان کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی اس لیے ترک عوام حکومت کے نقطۂ نظر میں بنیادی تبدیلی سے بے حد خوش و شادماں تھے۔ اس بنیادی تبدیلی کی اہمیت اس سے بے نقاب ہوتی ہے کہ ۱۹۲۵ء میں جب دینی مدارس کو مصطفیٰ کمال نے لپیٹ کر رکھ دیا تھا تو ان کے بارے میں

ہر سطح کے سیاسی رہنما دیہاتی ووٹ حاصل کرنے کے لیے مجبور ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو اسلام سے ہم آہنگ اور اس کا وفادار ثابت کر دکھائیں۔" (مسلم ورلڈ اکتوبر ۱۹۵۹ء)

یہ کہا تھا کہ: "یہ بُرائی کے اڈے ہیں" اُس وقت ان "اڈوں" کی تعداد ۲۴۲ تھی۔ مگر جب حکومت کا یہ گھناؤنا لقب ان کو ملا تو ان پر ایسی خزاں چھائی کہ دس سال کے بعد صرف ۲۰ رہ گئے اور وہ بھی کس مپرسی کے حالم میں۔ ۵۰ء میں ڈیموکریٹک حکومت نے اس لقب کو واپس لے لیا اور عوام خوشی کے مارے آپے سے باہر ہو گئے۔ علاوہ بریں سرکاری مدارس میں جہاں خالص سیکیولر تعلیم دی جاتی تھی؛ مذہبی تعلیم کو نصاب میں شامل کیا گیا۔ ۱۹۵۰ء میں پانچویں اور چھٹے درجے میں مذہبی تعلیم کو لازمی مضمون قرار دیا گیا۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مذہبی تعلیم کے شعبے جاری کیے گئے۔ انقرہ یونیورسٹی میں الٰہیات فیکلٹی کے نام سے ایک شعبہ قائم کیا گیا جس میں قدیم ترکی زبان کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا تاکہ مذہبی لٹریچر کے ان ذخائر سے فائدہ اٹھایا جا سکے جن سے ترکی کی لائبریریاں بھری پڑی تھیں۔

ان تمام جزوی اصلاحات کے پیچھے بظاہر وہ وعدے تھے جو اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے نام سے ترک عوام سے کیے گئے تھے۔ ترکوں کے بے پناہ دینی جوش اور روحانی طلب نے ان وعدوں کا خیر مقدم کیا اور اس بات کی پروا نہیں کی کہ ان کے پس منظر میں کیا مقاصد مضمر ہیں۔ البتہ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ ترکی کو ۳۰-۳۵ سال مذہب سے جُدا رکھنے کی جو کوشش کی گئی تھی اس کی وجہ سے ترک نوجوان اشتراکی یلغار کے سامنے ڈگمگاتے جا رہے تھے۔ اُن کو اشتراکی افکار کے خلاف اُکسانے اور انہیں ایک مضبوط قوتِ کردار سے بہرہ ور کرنے کے لیے مذہب کا واسطہ اختیار کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ چنانچہ مذہب کو اشتراکیت کے انسداد کا ایک کامیاب نسخہ سمجھ کر استعمال کیا گیا۔ مگر مغرب پرست عناصر کی یہ عجب اُلجھن سامنے آئی کہ ایک طرف تو وہ ترک نوجوانوں کے اندر مذہبی جذبات کے احیاء کی ضرورت بھی تسلیم کرتے ہیں مگر دوسری طرف مذہبی اصلاحات کے خلاف شور بھی مچاتے ہیں۔ ضرورت اس لیے محسوس کرتے ہیں کہ مذہب کے سوا کمیونزم کی روک تھام کے تمام حربے کند ثابت ہو رہے ہیں، اور چیں بجبیں اس لیے ہیں کہ ترکی اگر مسلمان بن گیا تو دنیا کے اندر اسلام کا دورِ عروج قریب سے قریب تر ہو جائے گا۔

بہرحال ان ملے جلے مقاصد نے ترکی کے لیے مذہب کے دروازے کھول دیئے۔ ترکوں کی مذہب پسندی کی دبی ہوئی چنگاریاں شعلۂ جوالہ بن کر اُبھر آئیں۔ اور وہ تمام کوششیں نقش برآب ثابت ہوگئیں جو ترکوں کو "جدید" بنانے اور ترکی کو یورپ کا ایک حصہ قرار دینے کے لیے انجام دی گئی تھیں۔ پروفیسر لوئس جیسا محتاط ناقد بھی یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ "ترکی میں اسلام کی جڑیں اس قدر گہری اُتر چکی ہیں کہ تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ بڑے سے بڑا طوفان بھی اسے اپنی جگہ سے ہلانے کی تاب نہیں رکھتا"۔

ڈیموکریٹک پارٹی اپنی چند ہلکی پھلکی اصلاحات کے بل پر عوام کے اندر اپنا دائرہ نفوذ وسیع کرتی رہی، اور چونکہ ملک کی خالص سیکولر فضا میں اسلام کے احیاء کی دھندلی کرنیں نظر آرہی تھیں اس لیے ترک عوام نے تمام خرابیوں کے باوجود اس پارٹی کو بہتر مستقبل کی تعمیر کے لیے ایک عارضی ذریعہ کی حیثیت سے قبول کر لیا۔ پارٹی کا غالب عنصر اسلام کے احیاء کی ضرورت محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کا فروغ فراخدلی سے برداشت کرنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا، اس لیے یہ جماعت مذہبی اصلاحات کے پہلو بہ پہلو مذہب کی سرگرمیوں کو دبانے کا کام بھی کرتی رہی اور مذہب کے نام پر کام کرنے والوں کو رجعت پسندی اور انقلاب دشمنی کے الزام میں جیلوں میں بھی ٹھونستی رہی۔

۱۹۵۸ء میں ڈیموکریٹک پارٹی کو تیسری مرتبہ الیکشن میں غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ اس مرتبہ عدنان مندریس کی شخصیت میں کئی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ وہ پہلے کی نسبت زیادہ مذہب کی طرف جھک رہے تھے اور مذہبی عناصر کا ساتھ دے رہے تھے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر نہ صرف ترکی کے ملاحدہ بوکھلا اُٹھے بلکہ بیرونی طاقتوں نے بھی بشدت تشویش و سراسیمگی کا اظہار کیا۔ خاص طور پر یہودیوں کی بین الاقوامی تحریک صیہونیت کے حلقے تدارکِ احوال کے لیے بیتاب ہو گئے[1]

---

[1] ترکی میں یہودیوں کی تعداد ۵۰ ہزار کے قریب ہے۔ ترکی کی معیشت اور صحافت پر ان کا بڑا اثر ہے۔ ترکی میں دونمہ کے نام سے ایک گروہ بھی پایا جاتا ہے۔ یہ لوگ بظاہر مسلمان ہیں۔ مگر بہ باطن یہودی ہیں۔ اسلامی

مقامی ملحد پریس اور امریکہ اور یورپ کے یہودی پریس نے عدنان مندریس کے خلاف زوردار مہم شروع کردی جو ۲۷ مئی ۱۹۶۰ء کے فوجی انقلاب پر منتج ہوئی۔

ان دو سالوں کے اندر مذہبی اصلاحات میں جو نمایاں اضافہ ہوا اُس کا خلاصہ یہ ہے:۔

حج سے بڑی حد تک پابندیاں اٹھالی گئیں[1]۔ مساجد کی طرف غیر معمولی توجہ دی گئی۔ صرف استنبول میں ۵ سو میناروں سے بیک وقت اذانیں بلند ہونے لگیں۔ حکومت کی امداد سے ایک ادارہ قائم کیا گیا جس کا نام تھا "انجمن اشاعت مطبوعات قدیمہ" اور اس کا مقصد تھا قدیم ترکی رسم الخط کا احیاء اور ترکی کے قدیم اسلامی لٹریچر کی از سرِ نو اشاعت[2]۔ حکومت نے مذہبی لٹریچر کی اشاعت سے تمام پابندیاں اٹھالیں۔ چنانچہ بدیع الزماں نورسی کے رسائل، جو اتاترک کے عہد میں خلافِ قانون تھے اور مرحوم نورسی کے تلامذہ انہیں راتوں کو ہاتھوں سے لکھ لکھ کر

خلافت کے خاتمہ میں ان لوگوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ انٹرنیشنل یہود فیڈریشن کا مرکز استنبول میں ہے۔ اسرائیل کو تسلیم کرنے میں اس عنصر کا بڑا دخل رہا ہے۔ حکومت اس پر قابو پانے کی پوری کوشش کر رہی ہے اور یہ خوشی کی بات ہے کہ مصر پر سہ طاقتی حملہ کے وقت ترکی حکومت نے اپنا سفیر اسرائیل سے واپس بُلا لیا تھا۔ اس کے بعد سے آج تک سفراء کا تبادلہ نہیں ہوا۔ اور آئندہ سب سے پہلے امکانات بھی ختم ہو گئے ہیں۔

[1] حج سے پابندیاں اٹھنے کے بعد ترکی حاجیوں کی تعداد میں سال بہ سال غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۵۰ء میں جب پہلی مرتبہ ترک مسلمانوں کو ۲۵ سال کی قدغن کے بعد حج کی اجازت ملی تو ۴۲۳ افراد نے فریضۂ حج ادا کیا۔ ۱۹۵۹ء میں جب پابندیاں اور کم ہوگئیں تو حجاج کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہو گیا۔ اور اب حج ترکی میں بالکل آزاد قرار پا چکا ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۴ء میں ترک حجاج کی تعداد ۲۱ ہزار ۶ سو ۳ تھی جو بیرونی حجاج میں دوسرے نمبر پر تھی۔ پہلے نمبر پر پاکستان کی تعداد تھی یعنی ۲۶ ہزار ۳ ۵۔ مگر یاد رہے کہ پاکستان کی آبادی ۱۰ کروڑ ہے اور ترکی کی ۳ کروڑ۔

[2] زمانہ کے انقلابات دیکھیے۔ ایک دن وہ تھا کہ انقرہ و استنبول کے چوراہوں میں لاطینی ترکی میں لکھے ہوئے بورڈ آویزاں تھے اور جو راہ گیران کو پڑھ نہ سکتا تھا سپاہی کوڑے سے اس کی تواضع کرتے تھے اور ایک دن یہ ہے کہ خود حکومت کی طرف سے ایسے ادارے کھولے جا رہے ہیں جو عربی رسم الخط سکھا کر ترک قوم کو اس کے سرمایہ اسلاف سے روشناس کرائیں اور جس ماضی سے ترکی کو منقطع کر دیا گیا تھا اس سے از سرِ نو ربط قائم کریں۔

پھیلاتے تھے، کھلم کھلا پھیلنے لگے۔ دوسرا مذہبی لٹریچر بھی کثرت سے منظرِ عام پر آنے لگا۔ اسلامی پریس کو آزادی کا سانس نصیب ہوا۔ انونو کے دور تک ترکی میں مذہب کے نام لیوا اخبارات و رسائل تقریباً ناپید تھے اور جو ایک آدھ پرچہ نکلتا تھا وہ بھی ہمیشہ حکومت کی غیظ آلود نگاہوں کا ہدف بنا رہتا تھا۔ مگر عدنان مندریس نے پریس کو اظہارِ خیال کی جونہی آزادی دی، ترکی کے اطراف میں ہزاروں اخبارات و رسائل نکلنے شروع ہو گئے۔ استنبول کا مقبول ترین ہفتہ وار حُر آدم (HOR ADAM)، نجیب فاضل کا ماہنامہ بیقتوغو، اشرف ادیب کا ماہنامہ سبیل الرشاد، صالح اوزجان کی زیرِ ادارت نکلنے والا ہلال، عثمان بکسی کا پرچہ سرد نگھتی اور ماہنامہ ووکان اور اس طرح کے اور لا تعداد اخبارات و رسائل فوری طور پر اسلامی محاذ کے نہایت گرمجوش اور جاں نثار سپاہی بن کر میدان میں آ گئے۔

ائمہ و خطبا کے مدارس کی تعداد بڑھا دی گئی۔ ان میں تعلیم کا معیار بھی اونچا کر کے مڈل اور سیکنڈری تعلیم کے ہم پلّہ قرار دیا گیا۔ مڈل کی مدتِ تعلیم ۴ سال اور سکنڈری کی ۳ سال مقرر کی گئی۔ اور مزید خوبی یہ پیدا کی کہ ایک طرف وہ تمام مضامین شاملِ نصاب کیے گئے جو وزارتِ تعلیم کے پبلک اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائے جاتے ہیں اور دوسری طرف اسلامی مضامین کا مکمل نصاب جاری کیا گیا[۱]۔ ان مدارس کے نظام کو مضبوط تر کرنے اور ان کے لیے باصلاحیت مدرسین تیار کرنے کے لیے "ہائر اسلامک اسٹڈیز" کے نام سے ایک ٹریننگ سنٹر نومبر ۱۹۵۹ء کو استنبول میں جاری کیا گیا۔ اس سنٹر کی مدتِ تعلیم ۴ سال ہے۔ اس کی وسعت اور صلاحیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے اساتذہ میں سات استنبول یونیورسٹی کے ڈاکٹر، اور تین ازہر کے فارغ علما ہیں۔ اور مقامی کالجوں کے پروفیسروں کی معتد بہ تعداد اس میں تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہے۔

---

[۱] ان مدارس کے اسلامی مضامین یہ ہیں: قرآن کریم، عربی زبان، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، فلسفہ قدیم، اسلامی علم الاجتماع، اسلام کا علم النفس، تاریخ مذاہب، اسلامی تاریخ، سیرت، اخلاق، تاریخ فن اسلامی، توحید، فارسی زبان و ادب، مغربی زبانوں میں سے انگریزی، فرانسیسی اور جرمنی میں سے کوئی ایک زبان۔

طلبہ کی تعداد ۳۰۰ ہے۔ اس ادارے کی طرف طلبہ کا رجحان اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ اگلے ہی سال حکومت کو قونیہ میں بھی اسی پیمانے کا ایک اور سنٹر قائم کرنا پڑا۔ اس سنٹر کے اندر بھی اس وقت تین سو کے قریب طلبہ زیر تربیت ہیں۔ ان دونوں سنٹروں میں جدید علوم اور اسلامی علوم نہایت عمدہ پیمانے پر پڑھائے جاتے ہیں[1]۔ ان کے اغراض و مقاصد یہ ہیں: (۱) ترکی کی قدیم اسلامی ثقافت کا احیاء (۲) نوخیز نسل کی اسلامی تعلیم و تربیت اور اسلام سے اُس میں سچا لگاؤ پیدا کرنا (۳) اعلیٰ معیار کے مفتی اور مبلغ تیار کرنا (۴) پبلک کے مڈل اور سکنڈری اسکولوں کے لیے دینیات اور عربی کے مدرسین تیار کرنا۔

جس ملک پر خالص لادینی نظامِ تعلیم جبر و تشدد کے زور پر فرمانروائی کر رہا تھا اور ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کو دین کی ہوا تک لگنے نہیں دی جا رہی تھی اُس ملک کے اندر دینی تعلیم سے یہ اعتناء عوام کے لیے بڑے خوشگوار تغیر کی خبر لا رہا تھا۔ عوام کی مُردہ امنگوں میں جان ڈال رہا تھا۔ اور قدرتی طور پر عوام کی تائید و حمایت کا رُخ بھی ان لوگوں کی طرف ہو رہا تھا جو ان اصلاحات کے علمبردار تھے۔

ڈیموکریٹک پارٹی کا تیسری مرتبہ ۵۸ء میں کامیاب ہو جانا اور عدنان مندریس کا پورے اختیارات کے ساتھ ترکی کے اُفق پر اُبھر آنا اصلاحات کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان شدید کشمکش کا موجب بن گیا۔ ترکی دستور کی رُو سے طاقت کا اصل مرکز وزیراعظم ہے، اس لیے عدنان مندریس مکمل اختیارات کے مالک ہو گئے تھے اور دوسری طرف عوام کی بے پناہ تائید نے انہیں بڑے سے بڑے اقدام کے لیے جری بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۵۸ء کے بعد موصوف نے بڑے دُور رس اقدامات کر ڈالے۔ ایک طرف مذہبی اصلاحات کی رفتار تیز کر دی، جن کا مختصر سا خاکہ

[1] ان کے اسلامی مضامین یہ ہیں: قرآن کریم، تفسیر، بلاغتِ قرآن، حدیث، توحید، عربی زبان و ادب، فقہ اسلامی، اصولِ فقہ، تاریخ مذاہب اسلامیہ، موازنۂ ادیان، اسلامی تہذیب کی تاریخ، ترکی ثقافت کی تاریخ، ترکی کا اسلامی ادب، قدیم فلسفہ، جغرافیہ بلادِ اسلامیہ، تاریخ انقلاب ترکی، تاریخ فنِ اسلامی، اسلام کا علم النفس، فلسفۂ اخلاق، تاریخ فلسفۂ اسلام، دعوت و تبلیغ، انگریزی، فرانسیسی اور جرمنی زبانوں میں سے کوئی ایک زبان، فارسی زبان و ادب

اوپر درج کیا گیا ہے، بلکہ اس پہلو میں انہوں نے یہاں تک جوش و خروش دکھایا کہ ایک مرتبہ انہوں نے جلسۂ عام میں اعلان کیا کہ "ترکی مسلمان ہے اور مسلمان رہے گا"۔ یہ فقرہ ترکی کے سیکولرازم پر ضرب کاری تھا[1]۔ دوسری طرف انہوں نے داخلی نظام میں بھی اہم تبدیلیاں شروع کر دیں۔ اور تیسری طرف ملک کی خارجہ سیاست کو پرانی ڈگر سے ہٹانے کے منصوبے بنانے لگے، جس کا مقصد یہ تھا کہ ترکی کو ایک طرف مسلمان ملکوں سے قریب تر لایا جاتے اور دوسری طرف اس کو امریکہ کے تسلط سے آزاد کر وایا جائے[2]۔ اسی خارجی سیاست کا ثمرہ یہ تھا کہ پاکستان کے ساتھ ترکی کے گہرے دوستانہ تعلقات کی داغ بیل عدنان مندریس ہی کے زمانے میں پڑی۔

اس کشمکش کا لاوا برابر پکتا رہا۔ مخالف عنصر نے یونیورسٹیوں کے طلبہ اور پروفیسروں کو عدنان گورنمنٹ کے خلاف بھڑکا دیا۔ اور مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان مظاہروں میں ترکی کے ساٹھ ہزار طلبہ میں سے تقریباً پانچ ہزار نے حصہ لیا۔ طلبہ کے غیظ و غضب کا فوری سبب یہ تھا کہ عدنان گورنمنٹ نے ترکی کے کثیر الاشاعت اخبار وطن کو حکومت کے خلاف اشتعال انگیزی کے الزام میں بند کر دیا تھا[3]۔ اس بندش کے خلاف امریکہ اور برطانیہ کے یہودی

---

[1] ترکی کا سیکولر دستور اگرچہ عدنان مندریس کی مذہبی اصلاحات میں حائل تھا، مگر انہوں نے دستور کے بجائے اپنے اختیارات کے بھروسے پر یہ اصلاحات کر ڈالیں۔ چنانچہ ۱۹۶۰ء کے فوجی انقلاب میں اُن پر جو الزامات لگائے گئے اور جن کی بنا پر انہیں سزائے موت دی گئی ہے اُن میں سب سے بڑا الزام دستور کی خلاف ورزی تھا۔

[2] ۱۹۶۰ء کا فوجی انقلاب جس تاریخ کو برپا ہوا ہے اُس کے ایک ہفتہ بعد عدنان مندریس روس کے دورہ پر جانے والے تھے۔ امریکی حلقوں کے اندر اس دورہ کی خبر نے بڑی ہلچل مچا دی تھی بلکہ فوجی انقلاب نے اس منصوبے کی بساط لپیٹ کر رکھ دی۔

[3] وطن اخبار کا ایڈیٹر احمد امین سلیمان ہے۔ یہ دوغلہ گروہ کا آدمی ہے۔ احمد امین کا اصل نام سالامون (SALAMON) ہے۔ اپنے پورے دورِ صحافت میں یہ ایک طرف صیہونی نظریات کی اشاعت کرتا رہا ہے اور دوسری طرف عربوں اور ترکوں کے درمیان منافرت کی آگ بھڑکاتا رہا ہے۔ ترک عوام اس سے بیحد نفرت کرتے ہیں اور اس کی حقیقت سے آگاہ ہیں۔

پیپر نے شور واویلا مچایا۔ اور خود ملک کے مخالفِ اسلام پریس نے بڑے اشتعال انگیز مضامین لکھے... ۲۷ مئی ۱۹۶۰ء کو فوج نے زمامِ اقتدار سنبھال لی اور عدنان مندریس اور ان کے ساتھیوں کو فوجی انقلاب کی عدالت سے موت کی سزا دے دی گئی۔ پھر ۱۹۶۱ء میں انقلاب کے سربراہ جمال گورسل نے نئے انتخابات کروائے جن میں دو پارٹیوں نے نمایاں حصہ لیا۔ ایک عصمت انونو کی ری پبلکن پارٹی اور دوسری عدنان مندریس کے حامی عناصر کی پارٹی۔ یہ پارٹی الیکشن سے کچھ عرصہ پہلے وجود میں آئی اور اس کے اندر وہ تمام عناصر مجتمع ہو گئے جو عدنان مندریس کی ڈیموکریٹک پارٹی میں شامل تھے۔ اس پارٹی کا نام "عدالت پارٹی" ہے۔ دونوں کی کامیابی کا تناسب تقریباً برابر تھا اور کوئی ایک پارٹی بھی واضح اکثریت حاصل نہ کر سکی۔ خاصی تگ و دو اور گفت و شنید کے بعد پیپلز ری پبلکن پارٹی اور عدالت پارٹی مخلوط حکومت بنانے پر رضامند ہو گئیں۔ مخلوط حکومت بنانے میں عدالت پارٹی کے اس عنصر کا تعاون تھا جو وقتی مشکل کو حل کرنے کے لیے عصمت انونو سے مصالحت کے لیے تیار ہو گیا لیکن یہ سطحی حل کامیاب ثابت نہ ہو سکا۔ اختلافات میں کوئی کمی نہ ہوئی اور بالآخر جون ۶۲ء کو مخلوط حکومت کو مستعفی ہونا پڑا۔ صدر جمال گورسل نے دوبارہ عصمت انونو کو کابینہ مرتب کرنے کی دعوت دی۔ اگر ہم صاف گوئی سے کام لیں تو یہ عرض کرنا پڑتا کہ محترم عصمت انونو نے برسرِ اقتدار آتے ہی مذہب کے معاملے میں وہی رویہ اختیار کیا جس کے وہ برسوں سے علمبردار ہیں اور جس کی ناکامی اور مضرت کا خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکے ہیں۔[1] چنانچہ فروری ۱۹۶۴ء میں عصمت انونو کی حکومت بجٹ پر رائے شماری کے موقع پر شکست کھا گئی[2] اور

[1] ہم اپنی اصولی تنقید کے لحاظ سے آں محترم کے بارے میں اس صاف گوئی پر مجبور ہوتے ہیں۔ ورنہ انہیں پاکستان سے جو تعلق ہے اس کا ہمیں پورا پورا احساس ہے اور ہم ان کی اس تائید و حمایت کے بے حد شکر گزار ہیں جو اپوزیشن کی طرف سے انہوں نے پاکستان کے حق میں کی ہے اور جس میں انہوں نے کہا ہے کہ "ہم پاکستان کے ہر دکھ سکھ میں شریک ہیں۔"

[2] اس شکست کا فوری سبب یہ تھا کہ قبرص میں صدر مکاریوس، ایوکا تحریک کے غنڈوں اور یونانی باشندوں کے ہاتھوں ترک آبادی کا قتل عام ہو رہا تھا، عورتوں کی عصمتیں لٹ رہی تھیں، بچوں کی بوٹیاں اڑ

عدالت پارٹی نے دوسری تین پارٹیوں (نیو ٹرکش پارٹی۔ جمہوریہ ملت پارٹی۔ پیپلز پارٹی) کے تعاون سے ایک مخلوط حکومت تشکیل کی۔ مگر اب اکتوبر ۶۵ء کے عام انتخابات میں عدالت پارٹی اتنی واضح اکثریت سے کامیاب ہوگئی ہے کہ اس نے یک جماعتی حکومت بنالی ہے۔ ان انتخابات میں عدالت پارٹی نے ۲۵۹ ری پبلکن نے ۱۲۷ نشستیں حاصل کی ہیں۔ اور یہ بات خاص طور پر قابل غور ہے کہ اس انتخاب میں جناب عصمت انونو کو ۴۰ اور ۵۰ کے درمیان ووٹ ملے ہیں۔

عدالت پارٹی نے فروری ۶۴ء میں دوسری پارٹیوں کے تعاون سے جب حکومت بنائی تھی اُس وقت مغربی پریس نے پھر خطرے کی گھنٹی بجادی تھی کہ ترکی کے اندر اسلام بڑا فروغ پا رہا ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے شہر زیورچ کے کثیر الاشاعت روزنامہ ٹیگس امینز یگر (TAGES ANZEIGER) نے جو جرمنی زبان میں نکلتا ہے[1]، ۵ اگست ۱۹۶۴ کی اشاعت میں لکھا :

"استنبول کے ۵ سو میناروں سے ہم از سر نو پانچ وقت کی اذانیں عربی زبان میں سُن رہے ہیں۔ عربی زبان اسلام کے نبی کی زبان ہے۔ یہ زبان مغرب پسند اتاترک کے عہد میں انتہائی ممنوع تھی۔ اتاترک نے روزمرہ کی زندگی میں عربی کا استعمال ناجائز قرار دے دیا تھا۔ چند ہفتوں کی بات ہے کہ یہ اذانیں بڑی طاقت کے لاؤڈ اسپیکروں سے بلند کی جارہی ہیں[2]۔ اس سے مؤذن کی آواز دس گنا قوی ہو جاتی ہے۔ پو پھٹتے ہی مؤذن

رہی تھیں، گاؤں کے گاؤں نذر آتش کیے جارہے تھے، مسجدوں اور عبادت گاہوں تک کو مسمار کیا جارہا تھا۔ ترکی کے مسلمان اس صورت حال کو برداشت نہیں کر رہے تھے اور عصمت انونو حکومت سے قبرص کے خلاف اعلانِ جنگ اور قبرصی ترکوں کی مکمل کھلا حمایت کا مطالبہ کر رہے تھے۔ مگر انونو حکومت نے امن کو جنگ پر ترجیح دی۔ اور عوام کے جذبات کی کوئی پروا نہ کی۔ چنانچہ بجٹ سیشن کے پہلے ہی اجلاس میں اُسے حکومت سے ہاتھ دھونے پڑے۔

[1] سوئٹزرلینڈ کی سرکاری زبان جرمن ہے۔

[2] چند ہفتوں سے مراد یہ ہے کہ جب سے عدالت پارٹی برسرِ اقتدار آئی ہے۔

کی آواز پردۂ شب کو اس شدت سے چاک کر دیتی ہے کہ استنبول میں نووارد شخص ہڑبڑا کر نیند سے بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ منظر ترکی کے موجودہ سیاسی رجحانات کے ساتھ، جو قریب کے عرصے سے سرزمین ہلال میں صاف محسوس ہونے لگے ہیں، ہم آہنگ ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تو ممکن تھا کہ آپ کمال پسند گروہ اور کمالی نظریہ کے وکلاء کی زبان سے یہ سُن لیتے کہ مذہبی اتحاد کی اساس پر استوار ہونے والے معاہدوں کی اس دور میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن اب پچھلے چند سالوں سے مذہب ترکی کے اندر اوّلین درجہ حاصل کرنے کا راستہ اختیار کر چکا ہے۔ اب کوئی چیز مذہب کو منزلِ مقصود تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی"۔

اس سے دو ماہ قبل فرانس کے ایک روزنامے "ٹریبیون ڈی جنیوا" (TRIBUNE DE GENEVE) میں روزنامے کے مشہور سیاسی تبصرہ نگار جان جاکس چوشیٹ (JEAN JAGUESCHCHOUET) نے ایک طویل مقالہ[1] میں لکھا:

"اتاترک نے ترکی کو سیکولر اسٹیٹ بنانا چاہا، اور ترکی کو اسلام کے پنجے سے[2] جس نے عثمانی سلاطین کو اپنا اقتدار قائم کرنے کی قوت فراہم کی تھی، نکال لینا چاہا۔ اتاترک اسلام کو رکیک فلسفۂ الٰہیات اور بداخلاق گاؤدی کا ذوق اور متعفن اور باسی وہم سمجھتا تھا[2] جس نے زندگی کو زہر آلود بنا دیا تھا۔ اتاترک کا یہ انقلاب بڑا بنیادی اور جوہری تھا۔ مجرد جمہوری نظام کی تاسیس کی نسبت انقلاب کو عوام سے منوانے کا بھی کامیاب نسخہ تھا۔ سلطنت کی تنسیخ نومبر ۱۹۲۲ء کو ہو گئی تھی البتہ خلافت کا خاتمہ ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو ہوا۔ مصطفیٰ کمال نے تو قرآنی تعلیمات کے اثرات شخصی زندگی سے محو کرنے کے لیے صرف سیکولر تعلیم اور سیکولر کلچر کے فروغ پر توجہ دی مگر عصمت انونو نے اپنے اقتدار کے پہلے

---

[1] ملاحظہ ہو شمارہ ۲۹ جون ۱۹۶۴ء

[2] نقل کفر کفر نباشد۔ یہ گھناؤنا الزام ہم صرف قارئین کو مطلع کرنے کے لیے نقل کر رہے ہیں ورنہ مقالہ نگار کی اسلام دشمنی اور مشرق بیزاری کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے۔

۴۲ سالوں کے اندر سیکولرازم کو صحیح معنوں میں دین کے استیصال کے لیے استعمال کیا لیکن اسلام ان سب کوششوں کے باوجود سخت جان نکلا۔ ان تمام کارروائیوں کے آگے وہ نہ جھک سکا۔ عدنان مندریس اس حقیقت کو پوری طرح سمجھ گیا تھا۔ اُس نے اقتدار کی کرسی تک پہنچنے کے لیے مذہب پر نگاہیں جمائے رکھیں۔ چنانچہ حکومت پر آتے ہی اُس نے سب سے پہلا جو فرمان جاری کیا وہ ترکی کے اندر عربی اذان کی اجازت کا تھا"

عدالت پارٹی کے پہلی مرتبہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد سے ہی مغربی اخبارات نے حسب معمول واویلا مچانا شروع کر دیا ہے کہ ترکی میں اسلام سر اٹھا رہا ہے۔ یہ اخبارات دراصل ترکی کے اس خوشگوار اور روشن مستقبل سے لرزاں ہیں جو ترکی کی عدالت پارٹی یا اسی طرح کے دوسرے اسلام پسند عناصر کے ہاتھوں تعمیر ہو رہا ہے۔ جیسے جیسے ترکی میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہو رہی ہے ترکی ایشیائی ممالک اور خاص طور پر عرب اور مسلم ممالک سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ بات بھی مغرب کے لیے سوہانِ روح بن رہی ہے۔ عربوں اور ترکوں کے تعلقات مکدر کرنے میں مغربی پریس نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن اب ان ناپاک منصوبوں کے علی الرغم عربوں اور ترکوں کے روابط تازہ ہو رہے ہیں۔ چنانچہ عدالت پارٹی کی حکومت کے دوران جنوری ۶۵ء کو انقرہ کا ایک وفد عرب ملکوں کا دَورہ کر چکا ہے۔ وفد کے لیڈر ترکی سینٹ کے ممبر پروفیسر سعدی قوقس تھے۔ پروفیسر موصوف نے دورہ کرتے وقت ایک بیان میں یہ کہا:

"وہ شخص ترکی کے خلاف صریح بہتان تراشی کرتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ ترکی اسلام کے بے نظیر و محبوب وجود سے الگ ہو گیا تھا۔ ہم فرزندانِ ترکیہ ایسے ہر شخص کو چیلنج دیتے ہیں کہ وہ کوئی ایک مثال بھی ایسی پیش کرے کہ ہم نے کبھی کسی مسلمان قوم یا مسلمان ملک کے خلاف دشمنِ اسلام طاقت کی کسی حقیقی معرکہ میں مدد کی ہو[1]"

---

[1] المسلمون فروری ۶۵ء

ترکی حکومت کے موجودہ سربراہ سلیمان ڈیمرل نے وزارت تشکیل دینے کے بعد اپنی حکومت کی جو پالیسی مرتب کی ہے وہ اعتدال اور احتیاط کی مکمل آئینہ دار ہے ۔ اور امید ہے کہ مرحوم عدنان مندریس اگر بعض معاملات میں عجلت پسندی اور اجتہادی غلطی کا شکار ہو گئے تھے تو موجودہ سربراہ بصیرت و ژرف نگاہی سے کام لیں گے ۔ سلیمان ڈیمرل نے اپنی پہلی تقریر میں یہ واضح کر دیا ہے کہ ان کی حکومت معیشت کے میدان میں نجی کاروبار کو فروغ دے گی ۔ سماجی بھلائی کے لیے مناسب اقدامات کرے گی ۔ مذہب سے آزادانہ تعاون کرے گی ۔ مذہبی اداروں کو مضبوط تر کرے گی ۔ ملک کو ایک دینی ریاست کے رنگ میں رنگے گی ۔ اور معاہدوں کی رکنیت کو برقرار رکھے گی ۔ ان تمام قرائن کے پیش نظر مولانا مودودی کا یہ خیال بے جا نہیں ہے کہ عدالت پارٹی سے ہم ترکی کے اندر احیائے اسلام کی توقع رکھتے ہیں ۔ عدالت پارٹی کا آرگن روزنامہ "عدالت" جس قوت اور صراحت سے اسلام کی دعوت پیش کر رہا ہے اس سے اس پارٹی کے عزائم سمجھنے میں خاص مدد ملتی ہے ۔